جانباز

سرگزشت

برصغیر کا سیاسی افق گدلا رہا تھا۔ سات سمندر پار سے آنے والے فرنگیوں کی بساط لپیٹی جارہی تھی۔ ایسے وقت میں اینگلو انڈین مخمصے میں تھے کہ کس کا ساتھ دیں، انگریزوں کا یا برصغیر کے لوگوں کا؟ وہ لوگ جو تعلیم یافتہ تھے ان کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ وطن ہی اہم ہے۔ راولپنڈی کا وہ خاندان بھی سمجھ چکا تھا کہ انگریز مذہبی طور پر تو قریب ہیں لیکن وہ ہم وطن نہیں ہیں اس لیے ہم وطنوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ مسلمان نہ ہوکر بھی وہ لوگ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے۔ یوں بھی وہ خاندان راولپنڈی کا معروف خاندان تھا۔ اس خاندان کا بڑا بیٹا ولایت پلٹ تھا۔ اس نے پرسٹن یونیورسٹی سے سائیکولوجی میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ ولایت سے لوٹتے ہی اسے لاہور کے ایف سی کالج میں پروفیسر کا عہدہ مل گیا تھا اور وہ لاہور منتقل ہوگیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی بچے بھی راولپنڈی سے لاہور آجائیں مگر اس کا بیٹا جو 10 جولائی 1927ء کو پیدا ہوا تھا، وہ ابھی چھوٹا تھا۔ اسی بچے کی خاطر وہ ہر مہینے راولپنڈی کا چکر لگایا کرتا تھا۔ گھر والوں نے اس کی بے تابی دیکھ کر بیوی بچے کو لاہور منتقل ہونے کی اجازت دے دی اور وہ مکمل طور پر لاہور آ گیا۔ یہاں اسے کالج کی طرف سے ایک بڑا مکان ملا ہوا تھا۔ بیوی کے آجانے سے وہ مکان جگمگا اٹھا، اسے بہت سی سہولت مل گئی، بچہ بھی نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے بچے پر خصوصی توجہ دینی شروع کردی۔ اس دور میں بچے کی پڑھائی چھ سات سال کی عمر سے شروع کرائی جاتی تھی مگر اس نے صرف ساڑھے تین سال کی عمر میں بیٹے کو پڑھنے کے لیے بٹھادیا۔ بچے کو بھی پڑھائی سے رغبت تھی، اس لیے چار سال کا ہونے تک اس نے اردو کی دوسری کتاب بھی ختم کرلی۔ تب اسے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اسکول میں وہ سب سے کم عمر تھا اس لیے سب اسے عزیز رکھتے۔ وقت کے ساتھ اس بچے کی تعلیمی قابلیت بڑھنے لگی۔ اس نے صرف پندرہ سال میں میٹرک کرلیا۔ ابھی وہ کالج میں داخلے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ پورے برصغیر میں تعصب کی آگ بھڑک اٹھی اور قیام پاکستان کا... اعلان ہوتے ہی فسادات ہوگئے یہ فسادات اتنے شدید تھے کہ تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔ غیر مسلم خود کو غیر محفوظ سمجھ کر ہندوستان جانے لگے اور وہاں سے لٹے پٹے مسلمان یہاں آنے لگے۔ اتنا خون خرابہ دیکھ کر پروفیسر صاحب بھی گھبرا اٹھے تھے۔ ان کے کئی رشتے دار پاکستان چھوڑ رہے تھے کہ انہوں نے اعلان کردیا کہ یہ پاکستان صرف مسلمانوں کا نہیں ہمارا بھی ہے اور ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ پروفیسر کے بیٹے نے والد سے کہا کہ یہ ہمارا ملک ہے تو اس کی حفاظت کی ذمے داری بھی ہم پر ہے اس لیے میں فوج میں جاؤں گا۔ اپنے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے اس نے 1947ء میں ائرفورس جوائن کرلیا۔ 1950ء میں اس نے گریجویشن کیا تو 1954ء میں اسے رائل ائرفورس کالج کارنیول بھیج دیا گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1958ء میں اسے ونگ کمانڈر بنادیا گیا۔ 1965ء میں جب بزدل دشمن نے پاکستان پر حملہ کیا تو یہ شیر کی طرح جھپٹا اور اس نے انبالہ، پٹھان کوٹ، آدم پور، سری نگر، جودھ پور کے علاوہ بھی کئی اہم فوجی تنصیبات کو تباہ کردیا۔ دشمن کے ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے فوجی اڈوں کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالا۔ اس وقت ان کا جذبہ دیکھ کر لوگ انگشت بہ دنداں تھے کہ نہ وہ خود آرام کرتے اور نہ ان کے ساتھی۔ ان کی بہادری، وطن پرستی پر انہیں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔ 1971ء کی جنگ میں بھی انہوں نے کئی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ اس جنگ میں بھی انہیں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔ 1972ء میں وہ ریٹائر ہوگئے۔ 30 جون 2011ء میں پاکستان کے مایہ ناز فرزند، دلیر مجاہد، قابلِ فخر ہستی مالکِ حقیقی سے جاملے اور اسلام آباد میں مدفون ہوئے۔ اس مردِ میداں کو ہم نظیر لطیف عرف مل لطیف کے نام سے پہچانتے ہیں جن کا قول تھا ''ہماری پہچان پاکستان''۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ

☆منشی محمد عزیز مےؔ کا بھرپور تجزیہ لندن وہاڑی سے۔ ''اس ماہ کے شمارے پر تبصرہ کرنے سے پہلے جنوری 2001ء سے لے کر اگست 2019ء تک دوسو چوبیس مہینوں کے دوران کل ننانوے خواتین و حضرات کرسی صدارت پر فائز ہوئے (افسوس کہ سنچری پوری نہ ہو سکی) سولہ خواتین نے مختلف ادوار میں چھبیس ماہ کرسی صدارت کا لطف اٹھایا جب کہ تراسی حضرات ایک سو اٹھانوے ماہ کرسی صدارت پر فائز رہے۔ لیڈیز فرسٹ کے قانون پر عمل پیرا ہوتے ہوئے پہلے خواتین کی کارکردگی کی تفصیل۔ ثمینہ شاہد (مرحومہ)، طاہرہ گلزار، کے جی رحمان، سمیرا ساجد، ریحانہ جلیل، فرزانہ آغا، ملیکہ رانی، مریم احمد، روبینہ نفیس انصاری، نزہت افتخار اور حمیرا کریم صرف ایک ایک بار ہی کرسی صدارت پر بیٹھ سکی ہیں۔ قرۃ العین زینب ایڈووکیٹ اور بشریٰ افضل کو دو بار یہ اعزاز ملا ہے۔ طلعت جبیں نیاز نے تین بار کرسی صدارت کا مزہ چکھا ہے اور شہناز ندیم جونیجو اور سدرہ بانو ناگوری فی کس چار مرتبہ صدر بن چکی ہیں ملک پاکستان کی نہیں بلکہ شہر خیال کی صدر۔ مرد حضرات میں احسن جمال حسنی، عبدالرؤف زرگر، حافظ نصیر احمد بیگ، پرنس آصف بٹ کشمیری، نعیم احمد راجپوت، دلبر حسین راجپوت، شوکت علی محسن، عرفان دربار، ملک عبدالوحید (مرحوم)، ایم اے حسینی انصاری، خالد شاہ جہاں چانڈیو، شیخ عرفان احمد، حامد علی، شبیر احمد دلبر، احمد اعجاز، حسن اکبر، خالد یوسفی، آصف رضا، رانا محمد نثار، محمد طاہر شبیر، عبدالقیوم، محمد صدیق عباسی، انتساب عباس، وزیر محمد خان، عبدالقادر، ذوالفقار انجم، محمد اشرف، آغا فرید احمد خان، سید طاہر شاہ بخاری، سید آکاش بخاری، ارشد علی ارشد، علی محمد دفا بردہی، ملک ثاقب شاد تنولی، راجا ثاقب نواز ثاقب، مجید احمد جائی، منظر علی خان، صداقت حسین ساجد، فلک شیر ملک، عبداللہ شجاع سندھی، سید مسرت حسین رضوی، انور عباس شاہ، سیف خان، ندیم اقبال (سفرنامہ نگار)، حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی، کوثر اسلام، محبت شاہ شکیل شاہ آفریدی، اختر صبا اور ظفر ندیم وغیرہ صرف ایک ایک بار صدارت کی کرسی پر بیٹھے۔ انوار الحق، محمد ایاز راہی، سردار ظفر اقبال وڑائچ، خالد حسن چیمہ (مرحوم)، رضوان احمد، شوکت رحمان خٹک، انجم فاروق ساحلی، اعجاز حسین لدھیانہ، ڈاکٹر آر ایم ای، وحید ریاست بھٹی، عبدالجبار رومی انصاری نے فی کس دو بار کرسی صدارت کا مزہ چکھا۔ انور اعجاز خان، سعید احمد چاند (مرحوم)، عمران اشرف جونانی، اویس شیخ نے فی کس تین بار شہرِ خیال کی صدارت کی۔ یونس علی بلوچ، نزاہت افشاں، صبغت اللہ محسن، شان احمد کشکوری، رضا احمد خان اعوان، ناصر حسین رند اور راقم الحروف منشی محمد عزیز مےؔ فی کس چار مرتبہ صدارت کی کرسی پر بیٹھے۔ زاہد علی، شاہد جہانگیر شاہد (مرحوم)، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، رانا محمد سجاد نے فی کس پانچ بار یہ اعزاز حاصل کیا۔ سوری ایک بلکہ دو دو افراد کا نام رہ گیا۔ مرزا طاہر الدین بیگ کا نام ایک مرتبہ کے صدور کے ساتھ شامل ہے جب کہ مشہور افسانہ نگار و شاعر جناب تفسیر عباس بابر تین مرتبہ شہرِ خیال کی صدارت فرما چکے ہیں۔ رانا محمد شاہد، عبدالرؤف عدم، خالد کبیر، چھ چھ بار شہر خیال کے صدر رہ چکے ہیں۔ عبدالرؤف عدم تو شاید ریٹائرمنٹ ہی لے چکے ہیں جب کہ رانا محمد شاہد مستقل مزاجی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ خالد کبیر بھی وقتاً فوقتاً ''شہرِ خیال'' کا چکر لگا لیتے ہیں۔ یک ماہی صدور کی طویل فہرست میں آفتاب احمد نصیر اشرفی مختلف ادوار میں آٹھ مرتبہ یہ اعزاز حاصل کر کے تیسری پوزیشن پر کھڑے ہیں۔ دوسری پوزیشن مشترکہ طور پر ہمایوں دین پوری آف خانپور کٹورہ اور ایم اے خالق بھٹی نے فی کس دس مرتبہ یہ اعزاز حاصل کیا ہے اور اس کرسی پر بیٹھنے کا اعزاز سب سے زیادہ حاصل کیا ہے۔ جناب اعجاز حسین سٹھار آف نور پور تھل، ہمایوں دین پوری، ایم اے خالق بھٹی اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے لیے بہت سی مبارک باد۔ اگر خطوط کی طرف چلیں تو بھی اعجاز حسین سٹھار کے آج یعنی اگست 2019ء کے شمارے تک کل ایک صد آٹھ (108) خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ رانا محمد شاہد کے 94 خطوط ''شہرِ خیال'' کی زینت بن چکے ہیں۔ سعید احمد چاند مرحوم کے 69 خطوط، مرزا طاہر الدین بیگ چھیاسٹھ خطوط، عبدالرؤف عدم چھپن خطوط، ایم اے خالق بھٹی ترپن خطوط، رانا محمد سجاد کے 49 خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر تبصرہ نگاروں کی

صاحبِ علم

ڈاکٹر ساجد امجد

علم ہی انسان کو اوج پر پہنچاتا ہے۔ عزت و تکریم کا حامل قرار دلواتا ہے۔ انہیں بھی عزت و شہرت علم نے بخشی ورنہ تو وہ ایک پسماندہ گائوں کے رہنے والے تھے جہاں وسائل نام کی کوئی شے نہ تھی پھر بھی انہوں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں آگے جانا ہے۔ ان کے اندر علم کی جو پیاس ہے اسے فرو کرنا ہے، سیراب ہونا ہے۔ بس اسی اُمید پر وہ نگر نگر ڈگر ڈگر پھرنے لگے۔ ان کی یہ جستجو، یہ جنوں شہرت کی بلندیوں کی طرف کھینچنے لگی۔ انہوں نے علم و ادب کی بھرپور خدمت کی لیکن ان کا اصل میدان دوسرا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز و اہل ہنود کا اثر مسلم معاشرے پر اثر انداز ہورہا ہے۔ اسی نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے ایسی ایسی قابل قدر کتابیں لکھیں، تدوین کیں کہ برصغیر کے تمام مسلمان رہتی دنیا تک ان کے مشکور رہیں گے۔

ایک معروف عالم دین، ایک مشہور قلم کار کی داستان زیست

ضلع اعظم گڑھ کے ایک دیہات علاؤالدین پٹی کی کچی پکی گلیاں سرخ جھنڈیوں سے سج گئی تھیں۔ دیہاتی اپنی حیثیت کے مطابق نئے کپڑوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ کھیتوں میں کام بند ہوگیا تھا۔ عید سے پہلے عید آگئی تھی۔ شیخ بدھو اپنے نسبتاً پکے گھر میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے اور انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ گھر کے سامنے میدان میں دیگیں چڑھ گئی تھیں۔

شیخ بدھو اس گاؤں کے اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ یہ خوشی اس خوشی میں تھی کہ ان کے بیٹے دین محمد کے گھر تین بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا۔ دین محمد اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ لہٰذا شیخ بدھو کو پوتے کی پیدائش کی بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔ گاؤں والے بھی اس خوشی سے سرشار تھے۔ دن بھر گلیوں میں یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔

''بھائی بڑے لوگوں کے بڑے چونچلے، بچے تو سب ہی کے ہوتے ہیں لیکن ایسی سخاوت نہیں دیکھی۔''

''بھائی دین محمد، شیخ بدھو کا اکلوتا بیٹا ہے اور اب اس کے بھی تین بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا ہے۔ جایداد کا وارث آیا ہے۔ خوشی تو ہونی ہے۔''

''شیخ بدھو ہیں بڑے دل کے۔ پورے گاؤں کی دعوت کی ہے، یہ کوئی چھوٹی بات ہے کیا؟''

''بھائی چھوٹے زمیندار کا نام کیا رکھا گیا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کیونکہ بالکل برابر میں رہتے ہو۔''

''سنا ہے عبدالسلام رکھا گیا ہے۔''

''نام تو اچھا ہے۔''

گلیاں ان باتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مرد شامیانے میں جمع ہوگئے تھے۔ عورتوں سے گھر بھر گیا تھا۔

لیمپ والی

ناصر ملک

یورپ، جس کی مثال دی جاتی ہے کہ وہاں عورتیں کتنی آزاد ہیں جب کہ وہی یورپ عورتوں کے لیے ایک وسیع قید خانہ تھا۔ انہیں سوائے گھر داری کے کسی کام کی اجازت نہ تھی۔ گویا وہاں عورتوں کی زندگی منجمد تھی۔ ایسے وقت میں ایک نو عمر دوشیزہ اٹھی، ظلمتِ شب کو ٹھوکر مارتی ہوئی ایک نئی شاہراہ کی داغ بیل ڈالی اور صبح کا اعتبار بن گئی۔ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اس کا نام ادب و احترام کا حامل ہے۔

خدمت خلق کی زندہ مثال، ایک لازوال کردار کا زندگی نامہ

فینی کی بیٹی جمالیاتی حسن کا شاہکار تھی، تبھی وہ ہر محفل میں موضوع سخن بننے لگی تھی اور جا بہ جا اس کے حسن کی تعریفیں ہونے لگیں۔ ملیح جلد، سیاہی مائل بھورے بال اور تراشیدہ بدن ہر دیکھنے والے کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا تھا۔ ایک معصوم سی بے پروائی ہر وقت اس کے چہرے سے جھلکتی رہتی تھی جو اس کی شخصیت کو مزید پُرکشش بنا دیتی تھی۔ فینی کو ہر وقت اس کی کسی ہم پلہ اور مناسب خاندان میں شادی کی فکر ستائے رکھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جو غلطی اس نے اپنی شادی سے قبل کیپٹن جیمس کی محبت آمیز رفاقت میں کی تھی، اس کی بیٹیوں سے سرزد نہ ہو۔

مقتولِ زیست

زین مہدی

شاعر نازک مزاج ہی نہیں، نازک دل بھی ہوتے ہیں، ذرا سی ٹھیس لگی اور بکھر گئے۔ اک ذرا سی بات اس کے درون و بیرون میں تغیر و طلاطم پیدا کردیتی ہے، وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ اس نے خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

اردو کے ایک بڑے شاعر کی زندگی کا عکس

وہ ایک کٹر مذہبی گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والدین نجیب آباد، ضلع بجنور کے تھے مگر فکر معاش نے انہیں الہ آبادی بنادیا تھا۔ اس کے والد سید لخت حسنین زیدی ڈی ایس پی آف سی آئی ڈی تھے۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے۔ احمد رضا، حیدر رضا، امیر رضا، عابد رضا، ناصر رضا، مجتبیٰ حسنین اور ارتضیٰ حسنین۔ بیٹی ایک بھی نہ تھی۔

مصطفیٰ حسنین 10 اکتوبر 1930ء کو رانی منڈی الہ آباد میں پیدا ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب سیاسی بیداری کی لہر دوڑ

کامریڈ لکھاری

نسرین اختر نینا

وہ مشہور قلمکار خاندان کا فرد تھا، قلم کی حرمت سے واقف تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے قلم میں جادو تھا۔ الفاظ سے کھیلنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ اسی فن نے اسے ممتاز کیا اور اس کی تحریر عالمی سطح پر پہچان بنانے لگی پھر جب وہ فلمی دنیا کی جانب آیا تو ایسی فلمیں لکھیں جو تاریخ ساز کہلائیں۔ وہ کمیونسٹ نہ ہو کر بھی کامریڈ کہلایا۔

اردو کے ایک نامور قلم کار کا تذکرہ

بمبئی میں ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ محلے کے محلے جلا دیئے گئے تھے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں ہر طرف محبت واخوت، امن و آشتی کا راج تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ اس شہر میں مقامی بہت کم تھے۔ اتنے تھے جیسے آٹے میں نمک۔ یہ شہر صوبہ مہاراشٹر کا صدر مقام تھا، پھر بھی مراٹھی دس فیصد تھے جب کہ نوّے فیصد دیگر صوبے سے آئے لوگ تھے۔ کوئی بنگال سے آیا تھا تو کوئی پنجاب سے، کوئی آسام کا تھا تو کوئی سندھ کا، کوئی بہار کا تھا تو کوئی یوپی (یونائیٹڈ پروینس) کا۔ گویا غیر مقامیوں کا

خودکش دستہ

احسن نعیم

یورپ کے کئی ممالک میں کھلے عام الزام لگایا جارہا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں۔ یہ تعصب کی انتہا ہے۔ اچھے برے لوگ ہر مذہب ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ ایسے ابو جہل تاریخ سے نابلد ہیں۔تاریخ بتارہی ہے کہ خودکش دستے تک یورپ سے شروع ہوئے۔ ایسا ہی ایک خودکش دستہ زندگی سے مایوس افراد کا تیار ہوا تھا جس نے دو افراد کو قتل کیا اور وہ قتل جنگ عظیم کی ابتدا بنا۔

اس قتل کی وجہ سے کئی لاکھ افراد مار دیے گئے

''صوفی صوفی، مرنا نہیں، اپنے بچوں کے لیے جیو۔''

یہ الفاظ تھے جو آسٹرو ہنگرین سلطنت کا ولی عہد اپنی مرتی ہوئی بیوی کو چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ باوجود یہ کہ وہ خود بھی چند لمحوں کا مہمان تھا۔ دونوں میاں بیوی کو پانچ فٹ کے فاصلے سے گولیاں ماری گئی تھیں اور دس سے پندرہ منٹ کے بعد دونوں میاں بیوی ختم ہو گئے مگر ان کے مرتے ہی یورپ کے لاتعداد لوگ مرنے والے تھے۔ لاکھوں بچے ماں باپ کے سائے سے محروم ہونے والے تھے اور پورے یورپ میں موت کا کھیل شروع ہونے والا تھا، اور کھیل کا مرکزی کردار ایک انیس سالہ نوجوان تھا۔

بعض اوقات کسی شخص کی غلطی اس قدر بھیانک نتائج لے کر آتی ہے کہ دنیا کانپ جاتی ہے۔ مذکورہ شخص کی غلطی کی سزا زمانے کو اور بعض اوقات نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ایسی ہی ایک غلطی جو ایک شخص یا چند لوگوں کے منصوبہ جس کے نتائج کچھ ایسے سامنے آئے کہ دنیا ہل کر رہ گئی نسلوں کی نسلیں اس غلطی کی بھینٹ چڑھ گئیں اور شہر کے شہر کھنڈر میں بدل گئے۔ بڑی بڑی

گمشدہ

شیراز خان

وہ ایک پُرسکون وادی تھی۔ ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا اس وادی کے سامنے ایک جنگل بھی تھا۔ اس جنگل کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں کہ وہاں جانے والا کبھی واپس نہیں آتا مگر رات کے اندھیرے میں غائب ہونے والوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

ایک عجیب وغریب واقعہ جس پر کئی فلمیں بنیں

یہ ایک بہت عجیب اورالم ناک پہلو ہے۔

بچے پیدا ہوتے ہیں۔ والدین ان کی پرورش اور تربیت میں اپنی نیندیں حرام کر لیتے ہیں۔ انہیں ہر دم اپنے سینوں سے لگا کر رکھتے ہیں۔۔ پھر اچانک وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں۔ کیوں چلے جاتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اسرار سے بھرا ہے۔

اس مضمون میں اغواء برائے تاوان قسم کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہ تذکرہ ہے ان لوگوں کا جنہوں نے معاشرے میں اپنا مقام بنایا، شہرت اور دولت حاصل کی، اس کے بعد اچانک کہیں غائب ہو گئے۔

وہ کہاں چلے گئے، انہیں کون لے گیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔

پوری دنیا میں اس طرح غائب ہونے والے ہزاروں افراد ہیں۔ ان میں ہر شعبے کے لوگ ہیں۔ غریب امیر، صنعت کار، سیاست دان، سائنسدان، تاجر، ادیب، فلمی اداکار، ادیب شاعر۔

فاتح یورپ

طارق عزیز خان

تاریخ میں بے شمار جنگجو کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے ملک پر ملک فتح کیے لیکن اس جیسا کوئی اور نہ تھا۔ اس میں بہادری کے ایسے جوہر تھے کہ کئی ہزار سال گزرنے کے بعد بھی لوگ اسے بھول نہیں پائے ہیں۔

رومن تاریخ کے ایک معروف جنگجو کا ذکر

مشہور یونانی حکمران سکندر اعظم نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہ کیا تھا۔ 323 قبل مسیح میں اس کے انتقال کے فوری بعد یونانیوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اس کشمکش میں سکندر کی ماں، بیویاں اور بچے سب مارے گئے اور اس کی وسیع و عریض سلطنت اس کے نااہل جرنیلوں میں تقسیم ہوگئی۔ سکندر کا چونکہ نوجوانی میں محض 26 سال کی عمر میں انتقال ہوا اور وہ مرتے دم تک ناقابل شکست رہا تھا اس لیے یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ اگر وہ چند سال اور زندہ رہتا تو مغربی یورپ کی تاریخ مختلف ہوتی۔ غالب امکان تھا کہ ایران کی فتح کے بعد سکندر کا اگلہ نشانہ رومی جمہوریہ تھا۔ تاہم یونانیوں میں سکندر کا کوئی وارث پیدا نہ ہوا جو اس کی وسیع سلطنت کو متحد رکھتا۔ یوں اگلے ڈیڑھ سو سال.... میں یونانیوں پر رومی چھا گئے

فلم نگری

سدا بہار فنکار

انور فرہاد

پاکستانی فلمی صنعت میں ایسے بے شمار فنکار گزرے ہیں جنہوں نے تاریخ مرتب کی ہے۔ انہی میں سے ایک وہ بھی تھا، اس نے جہد مسلسل کے ذریعے اپنا مقام حاصل کیا اور فلمی دنیا کا ہیرا ثابت ہوا۔ یہ مقام اس نے ایسے وقت میں حاصل کیا جب خداداد صلاحیتوں سے مالا مال فنکاروں کی کمی نہ تھی، اس بھیڑ میں بھی اس نے اپنا الگ مقام بنایا۔

ماضی کے ایک خوبرو اداکار کی داستانِ جہد مسلسل

اللہ اکبر۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ قادر مطلق ہے۔ سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ عزت شہرت اور سر بلندی وہ اسی کو دیتا ہے جو اس کا اہل ہوتا ہے جو خود ان کے حصول کے لیے اللہ پر بھروسا کر کے برے سے برے وقت میں بھی، محنت سے جی نہیں چراتا۔ دیانتداری کے ساتھ اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ اللہ دلوں کا حال جانتا ہے اس لیے اسے اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ آج اس

سراپا زہر

سید جاذب
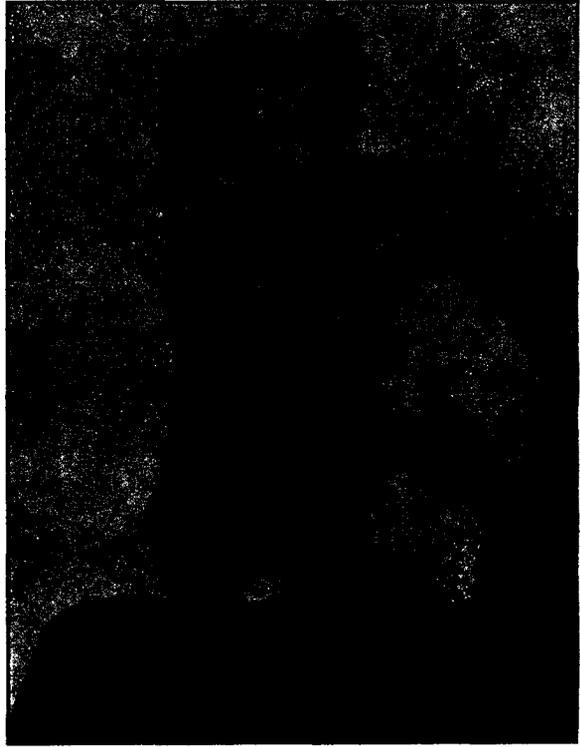
اس کے گلے میں جادو تھا، جب وہ گاتی تو ہر طرف اک وجد سا طاری ہو جاتا، آواز کے سوز و گداز سے اس نے پورے ملک کو مسخر کر رکھا تھا۔ خدا نے حسن بھی دیا تھا۔ اس کی خوب صورتی مثالی تھی، شاید اس لیے بھی اس کو پسند کرنے والوں کی تعداد کم نہ تھی۔ جب اس کا ستارا عروج پر تھا کہ یورپ میدانِ جنگ بن گیا۔ ایسے وقت میں جب ہر ایک کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آرہی تھی تو اس کے گانے کون سنتا؟ تب اس نے ایک خطرناک کام میں ہاتھ ڈالا، ایک ایسے کام میں جس کا تصور کوئی عام سی عورت کر ہی نہیں سکتی۔

اس کا شمار تاریخ کی بدنام عورتوں میں ہوتا ہے

''میں راہبہ نہیں بنوں گی...... نہیں بنوں گی...... نہیں بنوں گی......!''

یہ ایک کسان کی بیٹی کے الفاظ تھے جو کسی خانقاہ کی بلند و بالا، سرد اور بے مہر سنگلاخ دیواروں میں گھری ہوئی مذہب کی تاریک بھول بھلیوں اور غلام گردشوں میں گم ہو کر اپنی منزل کھونا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے والدین کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ کسی کو بھی ان کے حکم سے سرتابی کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اسے ایک راہبہ بنانا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اس کی لاکھ مخالفت کے باوجود اسے راہبات کی خانقاہ میں داخل کرا کے ہی دم

داستانِ اخبار

شکیل ادریس

خبریں یکجا کر کے تحریری طور پر شائع کرنے کی روایت بہت زیادہ پرانی نہیں ہے، پھر بھی عام افراد اس بارے میں بہت کم علم رکھتے ہیں۔

خوش ذوق قارئین کے لیے مختصر سی تحریر

پہلی اشاعت شدہ خبر، اس مفہوم میں کہ جسے رسمی طور پر لوگوں کے لیے عام کیا گیا ہو، وہ ''اکٹا دیورنا'' تھا جو روم میں 59 قبل مسیح منظر عام پر آیا۔ رومی سینٹ ہر روز دستی تحریر شدہ معلوماتی تختے عوامی جگہوں پر آویزاں کرتی تھی، جن میں دارالحکومت کی سیاسی اور سماجی زندگی کے بارے میں خبریں، رومن سینٹ کے تازہ ترین احکامات اور فیصلوں کے متعلق خبریں یا رپورٹس ان کو کاتب نقل کر کے شہر میں یا شہر سے باہر دل چسپی رکھنے والے شہریوں کو فراہم کر کے روزی کماتے

ساحرِ موقلم

شکیل صدیقی

قیام پاکستان کے بعد نامور مصوروں کی ایک قطار ابھر کر سامنے آئی۔ ایسے ایسے فن کی بلندیوں کو چھو لینے والے مصور جن کی لکیریں بولتی ہیں۔ اس کا شمار بھی ایسے ہی مصوروں میں ہوتا ہے۔ اس نے جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشن کے پرچوں کی تزئین کی خاطر شہکار تخلیق کیے تھے جس نے کہانیوں کی جاذبیت میں اضافہ کیا۔

ایک معروف مصور کی مختصر سی روداد

ہم سب ہی اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں کہ جب بچپن میں بیمار پڑتے ہیں اور اس کے بعد شفایاب ہو جاتے ہیں تو والدہ نہایت اپنائیت سے پوچھتی ہیں کہ تمھارے لیے کیا بناؤں؟ ہم انڈا پراٹھا یا پھر نہاری روٹی کہتے ہیں مگر اقبال مہدی کہتا کہ مجھے ڈرائنگ پیپر اور پینسل چاہیے۔ یہ قصہ سنانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ آرٹ اس کی رگوں میں بچپن سے دوڑ رہا تھا۔

وہ جب ذرا بڑا ہوا تو اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا مگر وہاں اس نے پڑھنے میں دل چسپی نہ لی اور تصویریں بنانے لگا۔ اسکول کی دیواروں پر اس کی بنائی ہوئی تصویریں نظر آتی
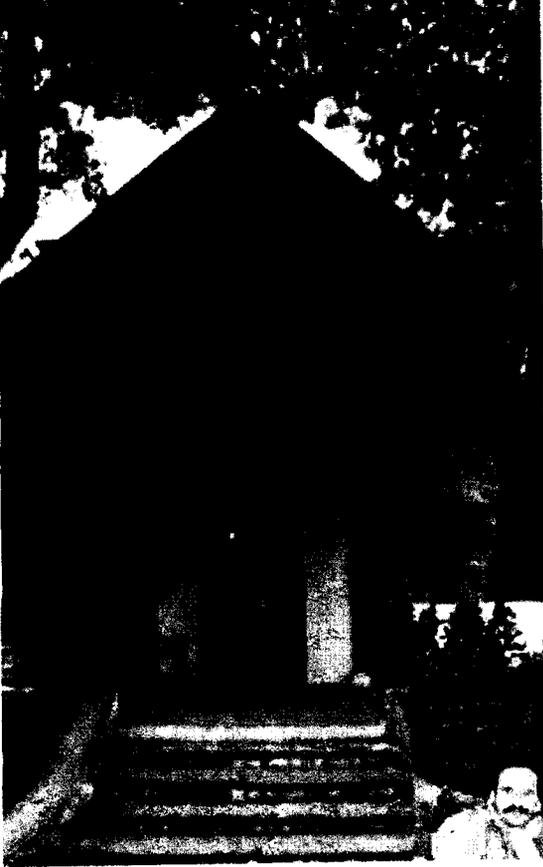
سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

قسط:4

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تك قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایك نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات وجذبات میں گندھی سفر کہانی

میرے ذہن میں یہ تھا کہ گاڑی کے آگے کوئی بکری وغیرہ آگئی ہوگی ڈرائیور نے یکا یک بریک دبائے تھے اس لیے سوزوکی کے ٹائر سے تیز آواز ابھری تھی۔ گھسیٹنے کی آواز۔ اس مکروہ آواز پر میں گھبرا اٹھا تھا اور چھلانگ مار کر نیچے اترا تھا۔ تبھی تو ڈرائیور کو اچانک بریک لگانا پڑ گیا تھا مگر جب گاڑی کے آگے نظر پڑی تو میں کانپ اٹھا۔ سڑک پر ایک سانپ پڑا تھا۔ سانپ کہنے سے ذہن میں کوئی گز بھر لمبے اور نیلے رینگتے سانپ کا تاثر ابھرتا ہے جسے درخت کی شاخ سے کچلا جاسکتا ہے مگر یہاں تو کوئی بیس فٹ سے قدرے لمبا اور چھ انچ کے قریب موٹا اژدھا تھا۔ دم پہاڑ پر
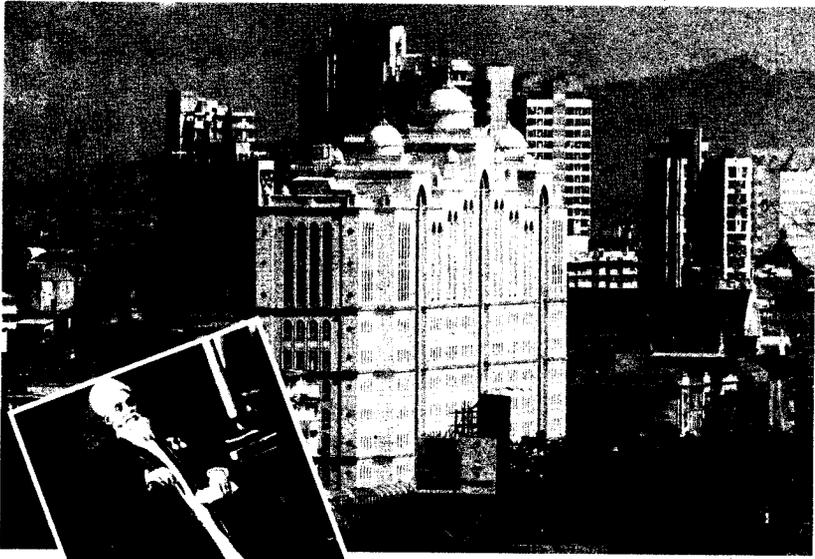
بڑا آدمی

سید احتشام

انگریزوں کی عملداری میں 1857ء کے بعد سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ زیادہ تر مسلمانوں کی ریاستیں چھن گئیں، اعلیٰ عہدے سے برطرف کردیئے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان معاشی طور پر کمزور ہو گئے۔ ایسے پُرآشوب دور میں ایک چھوٹے سے شہر کا 13 سالہ بچہ بمبئی آیا، پیٹ پالنے کے لیے سڑکوں پر آوازیں لگا کر ماچس کی ڈبی فروخت کرتا پھر ایک دور وہ آیا کہ اس پر دولت برسنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کروڑ پتی بن گیا۔ اس کی ترقی کا راز کیا تھا؟

ایک بہت بڑے آدمی کی داستانِ جہدِ مسلسل

1846ء میں بھارتی ریاست گجرات کے جزیرہ نما کاٹھیاواڑ کے ایک چھوٹے سے شہر دھوراجی میں ایک نہایت غریب اور مفلوک الحال شخص قادر بھائی اور سکینہ بانو پیر بھائی کی داؤدی بوہرہ فیملی میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آدم پیر بھائی رکھا گیا۔ اپنی غربت اور خاندانی پس منظر کے باعث اس لڑکے کو کبھی اسکول کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوسکی۔ زندگی غربت کی چکی میں پستی رہی۔ جب یہ لڑکا تیرہ برس کا ہوا تو اپنے والدین کے ہمراہ روزگار کی تلاش میں بمبئی آ گیا۔ قادر بھائی کی جیب میں صرف پانچ روپے تھے جو انہوں نے پیٹ کاٹ کر جمع کیے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ لوگوں کی تنخواہ پانچ یا دس روپے ہوا کرتی تھی۔ اس فیملی نے ایک مکان کرائے پر لے لیا جس کا ماہانہ کرایہ ایک روپیا تھا۔ یہ لڑکا بہت محنتی، ایماندار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھی سوجھ بوجھ اور مثبت سوچ کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ زندگی کا روشن پہلو دیکھتا تھا، خیر کی اُمید رکھتا تھا اور مایوسی کو کفر سمجھتا تھا۔

رقصِ موت

کشمالہ حسن

اس قصّبہ میں ایک عجیب و غریب وبا اتری، چاند جوبن پر آتا، جب چاندنی کھیت کرتی تب یکایک نوجوان لڑکے اورلڑکیاں رقص کرنے لگتیں، رقص بھی اتنا شدید کہ رقاص ناچتے ہوئے گرتے اور گرتے ہی مر جاتے۔

ایک عجیب وغریب بیماری کا احوال

اگا تھا نام تھا اس ملازمہ کا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی اور جس گھر میں... کام کرتی تھی وہاں بھی اسے بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اس کی عادتیں بہت اچھی تھیں۔

اس شہر کا نام آرکن تھا، ایک چھوٹا سا پُرسکون شہر۔ جہاں زندگی کسی نرم رو دریا کی طرح دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی تھی۔ اس شہر کے لوگوں کی عادتیں بھی صاف ستھری تھیں۔ یہ جرمنی کا ایک شہر تھا۔ دریائے رائین کے کنارے بسا ہوا۔

اگا تھا ایک لڑکے کو پسند کرنے لگی تھی۔ ویسے سالانہ
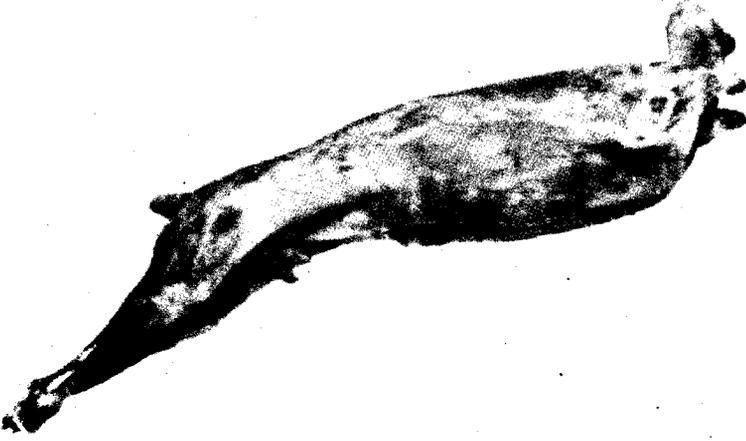
ایک آنچ کی کسر

ابو الفرح همایوں

محکمۂ پولیس کو خبر ملی که اس کا شوہر قتل ہو گیا ہے۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی که لوگ اس سے ہمدردی کرنے پر مجبور تھے، پھر قاتل نے بھی ایك ایسا طریقه آزمایا تھا که اس ترقی یافته ملك کی پولیس بھی چکرا کر رہ گئی۔ قاتل نے ایك ایسا آله قتل استعمال کیا تھا جو سامنے رکھا تھا مگر کوئی یقین نہیں کر سکتا که یہی آله قتل ہے۔

ایسی وارداتیں یورپ کے بے لگام معاشرے میں ہی ممکن ہیں

''اچھا چلو! میں ایسا کرتی ہوں کہ تمہارے لیے کچھ پنیر اور بسکٹ وغیرہ لے آتی ہوں تاکہ تم تازہ دم ہو جاؤ۔'' وہ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' مرد نے غصے سے جواب دیا۔

وہ اپنی کرسی میں کسمسائی مگر اس کی پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں بدستور مرد کے چہرے پر گڑی رہیں۔

''رات کا کھانا تمھیں ضرور کھانا چاہیے۔ میں بہ آسانی

بتیسویں قسط

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

اعتراف

محترم مدیر

السلام علیکم!

مرسلہ سچ بیانی کو میں کئی سال سے لکھنے کا سوچ رہا ہوں اس کے کئی کردار سے میری ہفتے عشرے میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ سچ بیانی ایسی سبق بھری ہے کہ اسے ہر ایک کو پڑھنا چاہیے۔ ہمارا معاشرہ بے حسی کی سمت جس تیزی سے بڑھ رہا ہے ہم کس طرح مفاد کی خاطر پستی میں گر رہے ہیں یہ اسی کا بیان ہے۔

تنویر ریاض
(کراچی)

میں دن بھر کا تھکا ہارا، گھر واپس آیا تو ایک غیر متوقع سناٹے نے میرا استقبال کیا جو میرے لیے باعث حیرت تھا ورنہ اس وقت گھر میں اچھی خاصی چہل پہل ہوتی تھی۔ چاروں بچے لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہوتے اور میری بیوی شاہینہ کچن میں شام کی چائے کا اہتمام کر رہی ہوتی۔ وہ جانتی تھی کہ دفتر سے آتے ہی مجھے چائے کی طلب ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی گھر کی بنی ہوئی کوئی چیز مثلاً سموسوں یا پکوڑوں کا ہونا ضروری تھا۔ اگر کسی وجہ سے یہ

وقفہ

جناب ایڈیٹر
السلام علیکم!
یہ خود میری سرگزشت ہے۔ بلکہ میرے والد کا کردار اس سچ بیانی میں اہم ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا یہ میرے والد کا سکھایا ہوا ہے۔ گو کہ یہ سچ بیانی الجھی ہوئی ہے اس لیے بغور پڑھنا ضروری ہے۔

روشن
(کراچی)

میں نے یہ کہانی اپنی ماں سے سنی۔
امی کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ امی نے کچھ اس طرح بتایا تھا۔
''بیٹے! خدا بھلا کرے تمہارے مرحوم باپ کا۔ وہ ایک عجیب مزاج کے انسان تھے۔ تمہارے نانا نے تمہارے کان میں جب اذان دینے کی کوشش کی تو تمہارے ابا نے ان کو روک لیا۔ نہیں محترم پلیز، بچے کے کان میں اذان نہ دیں۔''

بی کر کے سرکاری ملازم ہوگیا تو رضیہ خاتون کا ماتھا ٹھنکا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ کاشف کے ساتھ ساتھ سیما کے بھی فرض سے سبکدوش ہو جائیں مگر اب سیما کی طرف سے آنے والے رشتے میں اعتراض ہونے لگا۔ دو تین دفعہ تو رضیہ خاتون خاموش ہوگئیں لیکن جب ایک سول انجینئر کے رشتے کو سیما نے یہ کہہ کر ٹھکرایا کہ لڑکے کی چار بہنیں ہیں۔ ساس کے ساتھ دادی ساس بھی ہے تو رضیہ خاتون سے رہا نہیں گیا۔

''یہ کیا لگا رکھا ہے اس لڑکی نے؟ اب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ چار بہنیں ہیں۔ اس طرح تو عمر نکل جائے گی، ٹھیک ہے ہماری لاڈلی ہے ہمیں پیاری ہے لیکن ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ اگر وہ کام اپنے وقت پر ہو جائے تو بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ جب وقت ہی نکل جائے تو پیچھے پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے۔'' رضیہ خاتون کی مدلل تقریر جب ختم ہوئی تو کمرے میں کاغذات چیک کرتے ہوئے نجیب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ ''اللہ پاک ہماری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔ ہماری تو کوشش ہے کہ وہ جہاں بھی شادی ہو کر جائے بس خوش رہے۔'' نجیب صاحب نے خاموشی کو توڑا اور اپنے کاغذات سمیٹ کر بیڈ پر آ کر لیٹ گئے۔ بظاہر تو دونوں میاں بیوی خاموش لیٹے تھے مگر پریشانی اور سوچ کی لکیریں ان کے چہرے پر نمایاں دیکھی جا سکتی تھیں۔

☆......☆

لڑکیاں ہمیشہ ہار جاتی ہیں۔ لڑکیاں جو ہوتی ہیں۔ سیما بھی اس دن ہار گئی جب نجیب صاحب کے ایک پرانے دوست ذاکر ان سے ملنے آئے۔

''سیما بیٹی کا رشتہ کہیں طے کیا نجیب؟''

کھانے سے فارغ ہو کر سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ نجیب صاحب کے دوست نے جب یہ سوال کیا تو سیما اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

''ارے بھائی صاحب، آج کل اچھے رشتے مل کہاں رہے ہیں۔ کوئی اچھا اور شریف لڑکا ملے تو اس کے بھی ہاتھ پیلے کریں۔'' نجیب صاحب سے پہلے رضیہ خاتون بول پڑیں۔

''نجیب یاد ہے! دوبئی کے ٹور پر نوابزادہ رحمت خاں سے ملاقات ہوئی تھی؟'' ذاکر نے نجیب صاحب کو ہاتھ ہلا کر یاد دلانے والے انداز سے پوچھا۔

''کون؟ وہ جن سے ٹینڈر کے سلسلے میں ملاقات ہوئی

وصیت

جناب مدیراعلیٰ
سلام مسنون
اس وقت ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ عجیب و غریب دور ہے۔ ہمارے ارد گرد سازشوں کا نظر نہ آنے والا جال پھیلا ہے اور ہم نادانستگی میں پھنستے جارہے ہیں۔ ارشد فاروقی نے بھی کب سوچا تھا کہ وہ کسی ایسی سازش کا شکار ہو جائے گا اور اپنے بیوی بچوں سے دور ہو جائے گا۔ لوگ اسے غلط سمجھیں گے۔

سیدہ شاہدہ شاہ
(جہلم)

میں آفس میں آکر بیٹھی ہی تھی کہ کالج کے چپڑاسی نے ایک وزیٹنگ کارڈ میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ یہ کارڈ کسی ایڈووکیٹ میاں ظہور اختر کا تھا۔ میں نے سوچا، شاید کالج میں کسی بچی کے ایڈمیشن کا مسئلہ ہوگا یا کسی بچی کی پڑھائی کے سلسلے میں بات کرنی ہوگی۔ اس لیے میں نے بلالیا۔

روئی کے گالوں جیسے سفید بال اور چہرے کی جھریوں سے وہ ستر سال کے اریب قریب لگ رہا تھا۔ چہرے پر چھائی ہوئی متانت اور گہری سنجیدگی اس کے پیشہ وارانہ تجربے کی عکاس تھی۔ سیاہ کوٹ، کالی ٹائی اور وکیلوں والے مخصوص لباس میں وہ باوقار لگ رہا تھا۔

انتخاب

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی میرے ایک واقف کار کی ہے۔ ایک عجیب تجربہ ہوا اس کے ساتھ۔ لوگ زندگی کو تجرہ گاہ سمجھتے ہیں اور خود اپنی زندگی کو مسائل کا مجموعہ بنا لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

خلیل جبار
(حیدرآباد)

''میں نے دبئی میں دوسری شادی کر لی ہے۔'' میں نے اپنی بیوی صائمہ کو بتایا۔
میرا خیال تھا کہ میری اس بات پر صائمہ چیخ مار کر روئے گی۔ مجھے برا بھلا کہے گی۔ لڑے گی، جھگڑے گی، مگر ہوا اس کے برعکس۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ اس نے گویا لب سی لیے تھے۔ اطمینان تھا۔ میں سمجھا کہ شاید میرا جملہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہے اس لیے دوبارہ اپنا کہا دہرایا۔ اس پر وہ اطمینان سے بولی۔ ''ہاں میں نے سن لیا ہے کہ تم نے

زہرِ زباں

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ ہم نادانستگی میں کچھ ایسے سچ کو نظر انداز کردیتے ہیں جو ہماری زندگی میں اہم ہوتا ہے لیکن ہم معمول کی بات سمجھ کر انہیں بھلا دیتے ہیں۔ انیلہ پر اگر گھر والے توجہ دیتے تو شاید ایسا کچھ کبھی نہ ہوتا۔ میری گزارش ہے تمام والدین سے کہ وہ اپنے بچوں پر یکساں توجہ دیں۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ محبت نہ دیں۔

زویا شکور

وہ سر جھکائے سینے پر ہاتھ باندھے، اسکول بیگ کو پشت پر لٹکائے گرد و پیش سے بے نیاز تیز قدموں کے ساتھ چلتی جارہی تھی۔ اپنے اسکول کی وین اس نے دانستہ مس کردی تھی۔ گاہے بگاہے اپنے گالوں پر گرنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کی پشت سے صاف کرتی جارہی تھی۔ وہ دنیا کی ہر چیز سے روٹھ گئی تھی، ناراض ہوگئی تھی۔ کیا ماں باپ، بہن، دوست احباب کوئی بھی تو اس کا اپنا نہیں تھا۔ کوئی بھی تو اس کو اپنا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کسی کے لیے اہم نہیں تھی۔ وہ ایک فیلیئر تھی

محترمه عذرا رسول
السلام علیکم!
اللہ تعالیٰ کے نزدیک تکبر ناپسند ہے۔ کبھی بھی انسان کو تکبر سے کام لینا نہیں چاہیے۔ اب شائستہ صاحبہ کو ہی دیکھ لیں انہوں نے کس کس طرح لوگوں کے دل پر الفاظ کے نشتر چلائے تھے نتیجہ کیا نکلا؛ رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔

فرح انیس
(کراچی)

"کیسی ہیں تائی؟" سدرہ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

میں جو حیدر کے پاس بیٹھی باتیں کر کے اس کا دل بہلانے میں کوشاں تھی سدرہ کو دیکھ کر چونک سی گئی۔ وہ اپنی شادی کے بعد میرے پورشن میں کبھی نہیں آئی تھی بلکہ شادی سے پہلے بھی اس نے اس طرف آنا جانا کم کر دیا تھا۔ میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو میں بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بولی اور کن انکھیوں سے حیدر کو دیکھنے لگی جو سر جھکائے گم صم سا بیٹھا تھا۔

گھر پیارا گھر

مکرمی مدیراعلی
سلام تہنیت!
انسان زندگی بھر ایک چھت کی چاہ میں ہلکان ہوتا رہتا ہے۔ خود اس نے بھی ایک چھت، اپنی چھت کے خواب دیکھے مگر اس کے ہاتھ کیا آیا؟ بس یہ سمجھ لیں کہ اس سچ بیانی کو میں نے آنسوؤں سے لکھا ہے۔

وزیہ ظفر

''مجھے زندگی میں کچھ نہیں چاہیے سوائے ایک چھوٹے سے گھر کے۔'' اس نے بہت افسردگی سے کہا تھا۔
''چاہے کچا ہی کیوں نہ ہو مگر اپنا ہو جہاں پر آکر کوئی ہمیں ذلیل نہ کر سکے، ہماری عزت کی دھجیاں نہ اڑائے۔ جسے میں اپنی مرضی سے ڈیکوریٹ کر سکوں، جہاں پر پودے لگا سکوں۔'' اس کے لفظوں میں عجیب بے بسی، کرب تھا۔
''کیوں پریشان ہوتی ہو۔''
''پریشانی تو ہوتی ہے ابراہیم! گھر بدل بدل کر میں تنگ آگئی ہوں۔ کبھی یہاں بہت ساری دوستیں بنائی مگر......'' اس نے افسوس سے ابراہیم کو دیکھا تھا جو چپ